اقبال حضور باری میں

پروفیسر وقار عظیم

اقبال کے نکتہ چیں ہمیشہ سے اقبال کی ذات کو مجموعۂ اضداد اور ان کے کلام کو ان کی ذات کے متضاد عناصر کا عکس کہتے رہے ہیں۔ معترضوں کے نزدیک جس طرح ان کی شخصیت میں ہم آہنگی کی نمایاں کمی ہے اسی طرح زندگی کے اہم مسائل کے متعلق ان کے خیالات باہم مطابقت نہیں رکھتے۔ معاشرتی اور سیاسی زندگی کے بعض ایسے اہم پہلوؤں کے متعلق جو بنیادی طور پر ایک دوسرے کی ضد ہیں اقبال نے بار بار ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ وہ کبھی ایک کے اور کبھی دوسرے کے حامی اور مبلغ نظر آتے ہیں۔ وہ وطن پرست بھی ہیں اور وطن اور وطنیت کے شدید مخالف بھی، انہوں نے عشق کی مداحی و ثنا خوانی کو اپنا شاعرانہ اور فلسفیانہ مسلک بنایا ہے لیکن وہ عقل کی اعلیٰ صلاحیتوں سے انکار نہیں کرتے۔ وہ ایک خوش عقیدہ مسلمان ہیں لیکن ایسی سیاسی شخصیتوں کی تعریف میں رطب اللسان ہیں جن کی زندگی سر تا سر اسلامی شعار کی نفی کرتی ہے۔ ''انسانی ترقی کو بہ یک وقت تقلید اور اجتہاد پر منحصر جانتے ہیں۔ ان کے ضابطۂ حیات میں صلح و جنگ دونوں کو برابر کی جگہ ملی ہے۔ خودی ان کے نزدیک انسانی زندگی کی نمود و ارتقا کا واحد سرچشمہ ہے، لیکن خودی کی بلند ترین منزل ترک خودی یا بے خودی ہے۔ فکر و خیال کی ان متضاد کیفیتوں میں سے ایک کیفیت یہ ہے کہ اقبال خدا کا ذکر کبھی اس طرح کرتے ہیں کہ ان کا ایک ایک حرف رنگ عبودیت میں جذب و سرشار نظر آتا ہے اور کبھی یوں کہ سننے والے ان کی بیباکی و گستاخی پر انگشت بدنداں ہوتے ہیں۔ شکر کو اپنا شیوہ بنانے والا اقبال کبھی عبودیت کے پورے عجز و انکسار کے ساتھ کہتا ہے—

تری بندہ پروری سے میرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ

اور کبھی عبودیت کے سارے آداب ترک کرکے یہ پیشن گوئی کرتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ—

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

نیک دل مسلمان تو ''یا دامن یزداں چاک،، کہنے والے اقبال کے لئے مغفرت کی دعا کرکے خاموشی اختیار کرلیں گے لیکن اقبال کے فکر و شعر کے اس طالب علم کے لئے جو اقبال کے ظاہری فکری تضادات کی کوئی نہ کوئی تاویل یا توجیہہ کر لینا ہے اس خاص محل پر بھی غور و فکر کی ایک دعوت ہے اور اس دعوت کو قبول کرنے والوں نے اقبال اور اس کے خدا کے باہمی تعلق اور رشتے میں نظر آنے والے اس تضاد کی ایسی وجہ تلاش کی ہے کہ جب اسے مثالوں کے ساتھ پیش کیا جائے تو سننے والوں کی تشفی ہو جاتی ہے۔

اقبال کے اردو اور فارسی کلام کا اچھا خاصہ حصہ ایسا ہے جس میں انہوں نے خدا سے مخاطب ہوکر اپنے دل کی کوئی نہ کوئی بات کہی ہے۔ بات کہتے وقت ان کے انداز بیان اور لہجے میں برابر فرق پیدا ہوا ہے، اور لہجے کا یہ فرق اقبال کی شخصیت کے ان عناصر کے فرق کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جن کی بنا پر اقبال کو اضداد کا مجموعہ کہا گیا ہے۔ اقبال فلسفی شاعر ہیں اور انہوں نے اپنے افکار کو شعر کے سانچے میں ڈھال کر انہیں سننے والوں کے لئے زیادہ سے زیادہ موثر بنایا ہے اور یوں گویا فلسفی اقبال اور شاعر اقبال کی ذات اکثر و بیشتر ایک دوسرے میں جذب اور مدغم ہوکر شعر کے پیکر اور روح میں داخل اور اس میں جاری و ساری ہوئی ہے، لیکن بہ حیثیت مفکر اور فلسفی کے اقبال نے زندگی کے مسائل پر تین مختلف طریقوں سے نظر ڈالی ہے اور تینوں طریقوں میں وہ کسی نہ کسی کی وکالت کا منصب اور فریضہ ادا کرتے ہیں۔ کہیں وہ ''آدم،، کے وکیل ہیں، کہیں ''مسلمان،، کے اور کہیں خود اپنی انفرادی ذات کے۔ ان تینوں حیثیتوں سے اقبال کو خالق حقیقی کے سامنے مختلف طرح کی باتیں کہنی پڑی ہیں۔ باتوں کے اس فرق سے ان کے اظہار و بیان کا لہجہ متاثر ہوا ہے اور بعض اوقات اس نے ایسی صورت اختیار کرلی ہے کہ لوگوں کو اقبال کے خلاف طرح طرح کے فتوے صادر کرنے کا موقع ملا ہے۔ ان دلدوز اور دل خراش فتووں کا نشانہ عموماً ان کی شاعری کا وہ حصہ بنا ہے جس میں اقبال نے آدم کی حمایت اور وکالت کی ہے۔ آدم کی حمایت اور وکالت کرتے وقت ''آدم،، کی زندگی کے وہ تمام مرحلے اور منزلیں اقبال کے سامنے ہیں جن کا ذکر قرآن حکیم میں آیا ہے۔ زندگی کے ان مختلف مرحلوں پر آدم یا انسان کے جن امتیازی اوصاف اور صلاحیتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ بھی اقبال کی نظر کے سامنے ہیں۔ ان اوصاف اور صلاحیتوں میں جو وسیع امکانات پوشیدہ ہیں، اقبال نے ان کے تصور سے انسانی زندگی کا ایک مکمل نقشہ تیار کیا ہے۔ اور فکر کی گہرائی، تخیل کی بلندی

اور فن کی رنگینی سے اس نقشے کو ایسا سجایا ہے کہ جو کوئی اس نقشے کو دیکھتا ہے حیات انسانی کے طویل اور عظیم سفر کے مختلف مرحلوں کی جیتی جاگتی تصویریں اس کی نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔

زندگی کی پہلی منزل

اس زندگی کی سب سے پہلی منزل یہ ہے کہ خدا نے انسان کو پیدا کیا اور اس میں اپنی روح پھونک دی (نفخت فیہ من روحی)، اس کی فطرت کو فطرت الٰہی کے مطابق ٹھہرایا (فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا) اور فرشتوں سے فرمایا کہ میں اسے زمین پر اپنا نائب بنانے والا ہوں (انی جاعل فی الارض خلیفہ) اس پر فرشتوں نے کہا کہ تو اس کو اپنا نائب بناتا ہے جو زمین پر فساد اور خون ریزی کریگا۔ باری تعالیٰ کی طرف سے جواب ملا کہ جو کچھ مجھے معلوم ہے وہ تم نہیں جانتے۔ میں نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دئے ہیں (وعلم آدم الاسماء کلہا)۔ اس کے بعد چیزیں فرشتوں کے سامنے کی گئیں اور ان سے ان کے نام پوچھے گئے۔ فرشتوں نے اپنی لا علمی ظاہر کی اور آدم نے ان سب چیزوں کے نام بتادئے (فلما انباہم باسمائہم)۔ حیات آدم کا دوسرا اہم واقعہ یہ ہے کہ جب باری تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سوائے شیطان کے سب نے سجدہ کیا (فسجدو الا ابلیس) اور یوں ابلیس اپنے غرور کی وجہ سے انکار کرنے والوں کی صف میں شامل ہوا (ابی واستکبر وکان من الکفرین)۔

اس واقعے کے بعد سے ابلیس آدم کا دشمن بن گیا اور اسے بہکانے، ورغلانے اور راہ راست سے منحرف کرنے کو اپنا مقصد بنالیا۔ آدم نے جنت میں زندگی بسر کرنی شروع کی اور شیطان نے اسے بہکا کر حکم الٰہی کی خلاف ورزی کے راستے پر ڈالا اور اسکے بعد اسے دنیا میں بھیجنے کا حکم دیا گیا۔ آدم نے اپنی خطا پر ندامت ظاہر کی تو اس کی توبہ قبول ہوئی لیکن دنیا میں رہنے کا حکم برقرار رہا۔

آدم دنیا میں آیا اور اس نے ایک ایک کرکے اپنی صلاحیتوں سے کام لینا اور ماحول کو تسخیر کرنا شروع کیا۔ ماحول کی تسخیر کے اس بہت بڑے کام میں ارادے اور علم کی قوتوں کے علاوہ جستجو اور آرزو کی خلش نے اس کی رہبری کی اور اس نے اپنی قوت تسخیر سے ماحول کو بدل کر اپنے مقاصد

کا تابع کیا۔ اس میں حسن پیدا کیا، اس میں آسائشوں کے سامان مہیا کئے، اس میں رونق اور چہل پہل پیدا کی۔ اور یہ سب کچھ کرنے میں انسان طرح طرح کی سختیوں، آزمائشوں اور امتحانوں میں سے گزرا۔ اور ان آزمائشوں میں سے گزرنے اور ان میں لذت محسوس کرنے کو اپنی عادت بنالیا۔

اقبال نے حیات آدم کے ان مختلف اہم مرحلوں اور منزلوں کو اپنے فکر اور تخیل میں جگہ دیکر ان میں ایک فنی ترتیب پیدا کی ہے اور واقعات کو یہ فنی صورت دیتے وقت آدم کی زندگی کے وہ تمام واقعات بھی نظرمیں رکھے ہیں جن کا ذکر کلام پاک میں آیا ہے اور آدم کی سرشت اور فطرت کے ان حقائق کو بھی پیش نظر رکھا ہے جن کی طرف ان واقعات میں واضح یا مضمر اشارہ ہے۔ اس کے علاوہ اپنے وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے کی بنا پر انہوں نے انسانی زندگی کی تاریخ سے بعض نتیجے نکالے ہیں۔ پھر ان سب چیزوں کو ملا جلا کر حیات آدم کے ڈرامے کو بہت سے مناظر میں تقسیم کیا ہے۔ یہ مناظر تخلیق آدم سے شروع ہوکر اس کی زندگی کے اس دور تک کا احاطہ کرتے ہیں جب آدم کو دنیا میں اپنا کام ختم کرکے روز حساب اپنے نامۂ اعمال کے ساتھ بارگاہ ایزدی میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ حیات آدم کی اس طویل داستان میں اقبال نے ایسے پہلوؤں پر نسبتاً زیادہ زور دیا ہے یا ایسے پہلوؤں کو نسبتاً زیادہ ابھارا ہے جو انسانی فضیلت اور عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ انسان جب اس دنیا میں آیا تو خدا کا نائب اور خلیفہ بنکر آیا اور تسخیر فطرت کا دشوار کام اس کے سپرد ہوا۔ خدا نے اسے بعض ایسے اوصاف سے متصف کیا جن کی بدولت وہ اشرف المخلوقات ٹھہرا اور اسے فرشتوں پر بھی تفوق حاصل ہوا۔ خدا نے اس کے دل کو جستجو کے ذوق اور آرزو کی خلش سے آشنا کیا۔ اس کے سینے کو محبت کے شعلے سے منور اور پرسوز بنایا۔ اسے طبع بلند عطا کی۔ اسے امتحانوں اور آزمائشوں میں سے گزرنے کا حوصلہ دیا اس میں طوفانوں کی سختیاں جھیل کر خوش رہنے کی عادت پیدا کی۔ یہ سب باتیں تو ایسی ہیں جن کی طرف طرح طرح کے اشارے کلام پاک میں جابجا موجود ہیں لیکن اس کے علاوہ بعض اور صریحی باتیں بھی ہیں جن کے تصور کے بغیر حیات آدم کا افسانہ مکمل نہیں ہوتا یا یوں کہنا چاہئے کہ اس میں کہانی کی پوری لذت نہیں پیدا ہوتی۔ انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود اپنے سفر حیات میں بار ہا ذلت و خواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بعض اوقات یہ ذلت اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ وہ مخلوقات میں سب سے حقیر اور سب سے کمتر معلوم ہونے لگتا ہے۔ انسان

خدا کا خلیفہ اور نائب ہے اور دنیا میں آکر اسے کائنات کی تسخیر کا جو منصب ادا کرنا ہے اس کی وسعت کا ٹھکانا نہیں، لیکن انسان کو جو زندگی ملی ہے وہ مختصر بھی ہے اور ناپائیدار بھی۔ انسان کو زندگی کے ہر مرحلے پر خیر و شر کی کشمکش میں مبتلا ہونا پڑتا ہے اور اس کی فطرت کے بعض تقاضے اسے خیر کے بجائے شر کی طرف مائل کرتے ہیں۔ انسان یزداں صفت ہوکر بھی اہرمن کے فریبوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

انسان اور خدا

اقبال کی فارسی اور اردو غزلوں، نظموں، رباعیوں اور بعض اوقات اکا دکا شعروں میں انسانی زندگی کے ان مختلف رخوں کی بڑی دلکش تصویریں ملی ہیں اور ان تصویروں کی ترتیب سے ایک موثر ڈرامہ مرتب ہوکر ہمارے سامنے آتا ہے لیکن ان تصویروں سے الگ ہٹ کر ایک اور طریقے سے یہ ڈرامہ اور بھی زیادہ موثر انداز اختیار کرتا ہے اور وہ طریقہ وہی ہے جس کی طرف میں نے اس مضمون کے شروع میں اشارہ کیا ہے۔ اقبال نے اپنے فارسی اور اردو کے کلام میں صدہا مقامات پر خدا کو مخاطب کرکے ایسی باتیں کہی ہیں جو آدم کے افسانے کی کسی نہ کسی کڑی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ باتیں کہتے وقت اقبال کے لہجے پر عموماً شکوے کا رنگ غالب رہا ہے اور یہ شکوہ کبھی کبھی اتنا تیز ہوگیا ہے کہ اسے آسانی سے گستاخی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ گستاخی نمائندگی، حمایت اور وکالت کے اس منصب کی پیدا کی ہوئی ہے جو اقبال نے خود اپنے ذمے لیا ہے۔ اس منصب کو ادا کرنے کا جو اسلوب اقبال نے اختیار کیا ہے اس میں بلاشبہ ایک ''بندۂ گستاخ،، کی بیباکی ہر جگہ موجود ہے لیکن اس گستاخی اور بیباکی میں فن کی جو لطیف رنگینی ہے اس سے انکار مشکل ہے۔ اقبال کے کلام کا وہ تمام حصہ جو گستاخی و بیباکی کے فتوے کی زد میں آتا ہے ان کے شاعرانہ تخیل کے حسن کاری کا کرشمہ بھی ہے۔ انسان کی وکالت کے سلسلے میں اقبال نے بار بار جس بات پر زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان نے جب دنیائے آب و گل میں قدم رکھا تو یہاں ویران و غیر آباد بیابانوں اور کوہساروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ زندگی تاریک اور بے رونق تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا اور خاموشی۔ انسان نے ہزار طرح کی سختیاں جھیل کر خار زاروں کو گلستان بنایا۔ بزم آرائیوں کی طرح ڈالی اور زندگی کو رونق اور چہل پہل کے مفہوم سے آشنا کیا۔ راتوں کی تاریکی میں اجالا پھیلایا اور بزم آرائی حیات انسانی کی مستقل رسم بن گئی۔ انسان کے اس عظیم

کارنامے کا ذکر اقبال بڑے فخر اور بعض اوقات بڑے غرور کے ساتھ کرتے ہیں اور انسان کی اس کارگزاری کے سامنے انہیں خدا کی کرشمہ سازی بھی ہیچ اور بے حقیقت معلوم ہوتی ہے —

میں کہاں ہوں تو کہاں ہے ؟ یہ مکاں کہ لامکاں ہے
یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی؟

مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے
وہ دشت سادہ و تیرا جہان بے بنیاد

ساز تقدیرم و فد نغمہ' پنہاں دارم
ہر کجا زخمہ' اندیشہ رسد تار من است
اے من از فیض تو پائندہ ! نشان تو کجاست؟
این دو گیتی اثر ماست، جہان تو کجاست؟

اس 'نشان تو کجاست ؟ ، اور 'جہان تو کجاست؟، میں طنز کا جو ہلکا سا نشتر ہے اس سے قطع نظر یہاں انسان کے انتھک عمل اور اسکے دور رس نتیجوں کی طرف بھی بڑا بلیغ اشارہ ہے ۔ لیکن ان اشعار میں تخیل کی وہ کرشمہ سازی نہیں جس سے اقبال کی وہ گستاخی جو خدا کی شان میں ان سے اکثر سرزد ہوئی ہے، بے نیاز معبود کی بارگاہ میں ناز پرورده عبد کی شوخی بن جاتی ہے ۔ اپنی ایک چھوٹی سی نظم میں اقبال نے انسانی عمل کی عظمت اور اس عمل کے نتائج کی وسیع اثر انگیزی کی طرف جو اشارہ کیا ہے اس کے لئے بڑے فن کارانہ انداز میں ایک تمہید قائم کی ہے اور یہ تمہید قائم کرتے وقت انسانی عمل کے بعض ایسے پہلوؤں کا ذکر کیا ہے جن کی نوعیت تعمیری کم اور تخریبی زیادہ ہے ۔ خدا نے جب فرشتوں کو یہ خبر سنائی تھی کہ میں زمین پر ایک نائب بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے کہا تھا کہ 'کیا تو اس کو نائب بناتا ہے جو زمین میں فساد و خون ریزی کریگا، ۔ فرشتوں کی یہ پیشین گوئی اسطرح پوری ہوئی کہ انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کو طرح طرح کے گروہوں میں تقسیم کیا، اپنے ذاتی نفع کی خاطر جنگ و جدال میں مصروف ہوا اور جنہیں خدا نے آزاد رہنے کے لئے پیدا کیا تھا انہیں قید و بند میں گرفتار کیا ۔ اقبال نے زندگی کے ان حقائق کو تمہید بنا کر انسانی عمل اور سرگرمی کے روشن پہلوؤں کا بڑا ہمہ گیر نقشہ پیش کیا ہے یہ نقشہ حیات انسانی کے

ان تمام رخوں کا احاطہ کرتا ہے جن کی بدولت انسان نے کائنات کے پوشیدہ حسن کو بے نقاب کرکے اسے نکھارا اور سنوارا۔ اس چھوٹی سی نظم کا عنوان ہے ''محاورہ مابین خدا و انسان''۔ پہلے تین شعروں میں خدا انسان سے مخاطب ہے اور اس کے بعد کے تین شعروں میں انسان کی عظمت اور برتری کی ترجمانی ہے۔

(خدا)

جہاں را ز یک آب و گل آفریدم — تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولاد ناب آفریدم — تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہال چمن را — تفس ساختی طائر نغمہ زن را

(انسان)

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم — سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اقبال نے ان تین شعروں میں آدم کی تخلیقی صلاحیتوں کی جو پر زور اور موثر وکالت کی ہے اس میں ان کے حکیمانہ انداز فکر کے علاوہ جو چیزیں ایک ایک حرف پر چھائی ہوئی ہیں ان میں سے ایک ان کے تخیل کی ثروت ہے اور دوسری ان کے شاعرانہ احساس کی نزاکت اور لطافت۔ تخیل نے انسان کے تخلیقی عمل کے ان چند گوشوں کو یکجا کیا ہے جو زندگی کے حسن اور اس کی راحتوں کے بہترین مظہر اور نمائندے ہیں اور تخیل کی سمیٹی اور یکجا کی ہوئی چند نمایاں حقیقتوں کو شاعرانہ اظہار نے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایک طرحدار پیکر کی شکل دی ہے۔ نظم کے چھ مصرعوں میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو کوئی نہ کوئی منصب ادا نہ کر رہا ہو۔ لفظوں کی ہموار، منظم اور مرصع ترتیب میں، ان کے پر ترنم آہنگ میں، ان کی موزوں اور برمحل تکرار میں تاثیر کا طلسم پوشیدہ ہے اور یہ سب چیزیں مل کر وکالت کے اس منصب کو جس کے انجام دینے میں اقبال نے شاعرانہ وسیلوں سے مدد لی ہے تقویت بھی دیتی ہیں اور اسے زیادہ سے زیادہ موثر بھی بناتی ہیں۔

انسان کو اپنی بے پایاں صلاحیتوں کا احساس ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اسے دنیا میں آکر نیابت الہی اور خلافت خداوندی کا جو اعلی منصب ادا کرنا ہے اس میں اسے انہیں صلاحیتوں سے مدد لینی ہے اور یہ کہ دنیا میں رہ کر فطرت کو تسخیر کرکے اسے اپنے مقاصد کا تابع بنانا ہے لیکن

اس بہت بڑے اور بہت پھیلے ہوئے کام کی تکمیل کے لئے مدت بھی لامحدود ہونی چاہئے ۔ اسی لئے انسان کو خدا سے یہ شکایت ہے کہ اس نے اسے ایسی زندگی دی جو مختصر بھی ہے اور فانی بھی ۔ اس خیال کو اقبال کے تخیل نے بہت سی صورتوں میں دیکھا ہے اور ہر صورت کا نقش اپنی شاعرانہ صناعی اور صورت گری سے تیار کیا ہے ۔ تخیل کی اس صورت گری میں شکایت کا رنگ کہیں تو ہلکا ہے جیسے اس شعر میں—

گناہ ما چہ نویسند کاتبان عمل نصیب ما زجہان توجز نگاہے نیست

اور کہیں اس میں بڑی تلخی، تیزی اور تندی ہے ۔ جیسے اس شعر میں—

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہان دراز ہے اب مرا انتظار کر

اس شعر میں طنز بلکہ طعنہ کی جو شدید کیفیت ہے اس کے پس منظر میں ''حیات آدم،، کے بڑے اہم بلکہ شاید سب سے اہم واقع کی گونج سنائی دے رہی ہے ۔

اس شکایت کے علاوہ کہ خدا نے اتنا بڑا کام انسان کے سپرد کرکے اسے مختصر سی زندگی دی ۔ انسان کو اور اسلئے بہ حیثیت انسان کے وکیل کے اقبال کو خدا سے اور بھی طرح طرح کی شکایتیں ہیں اور ان شکایتوں کا بیان ان کی نوعیت کے فرق کی بنا پر مختلف طریقوں سے ہوا ہے یا یوں کہنا شاید زیادہ صحیح ہو کہ جیسی شکایت ہے ویسا ہی شکایت کا لہجہ بھی ہے ۔ ان گوناگوں شکایتوں میں سے ایک یہ ہے کہ خدا نے انسان کے دل میں وہ کیفیت پیدا کی جسے اقبال کبھی ''سوز مشتاق،، کہتے ہیں اور کبھی ''عشق بلا انگیز،، ۔ خدا نے انسان کو ''سوز مشتاق،، اور ''عشق بلا انگیز،، کی دولت بے پایان تو عطا کی لیکن اس کی تسکین کے لئے جس ماحول اور فضا کی ضرورت تھی اس سے اسے محروم رکھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس آگ نے نہ جانے کتنے نیستانوں کو خاکستر کیا ۔ انسان کو اس کا احساس ہے، لیکن یہ احساس جرم کا احساس ہرگز نہیں اس لئے کہ انسان اسے اپنی نہیں خدا کی خامی اور کوتاہی سمجھتا ہے اور اسلئے کسی جھجک اور خوف کے بغیر کبھی شکوہ و شکایت کے انداز میں اور کبھی طنز و تشیع کے لہجے میں اپنے دل کی بات کہہ ڈالتا ہے ۔ اقبال نے اپنے شعروں میں جہاں کہیں شکایت

یا طنز کا یہ انداز اختیار کیا ہے ان کی حیثیت ایک ایسے وکیل کی ہے جو بہ ہر صورت اپنے مؤکل کو بے قصور ثابت کرنا چاہتا ہے ۔ اقبال ایک جگہ کہتے ہیں—

اے خدائے مہر و مہ خاک پریشانے نگر
ذرہ در خود فرو پیچد بیابانے نگر

بر دل آدم زدی عشق بلا انگیز را
آتش خود را باغوش نیستانے نگر

''بر دل آدم زدی عشق بلا انگیز را،، میں شکایت ادب کے دائرے سے باہر نہیں نکلی ۔ لیکن یہ عشق بلا انگیز جب شرار بن کر خرمن ہستی کو جلانے لگتا ہے تو اس کے شعلے لفظ بن کر زبان پر آ جاتے ہیں اور انسان عاجز اور پریشان ہو کر چیخ اٹھتا ہے ع

شرار از خاک من خیزد، کجا ریزم، کرا سوزم؟

اور پھر یہ آگ شکوہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے ع

غلط کردی کہ در جانم فگندی سوز مشتاقی

ادب کی زنجیریں پاش پاش ہو جاتی ہیں اور دل کی بغاوت خالق حقیقی سے یہ کہنے میں تامل نہیں کرتی کہ ''غلط کردی،، ۔ پہلے مصرعے میں عجز اور پریشانی کے باوجود جو تھوڑی سی احتیاط ہے وہ دوسرے مصرعے میں اس طرح ختم ہوتی ہے جیسے اب اس پر کسی کا اختیار باقی نہیں رہا ۔ لیکن یہی بات اقبال نے بعض جگہ اسطرح کہی ہے کہ وہاں احتیاط اور ادب کا یہ ھلکا سا پردہ بھی موجود نہیں کہ تجربے کی شدت مجبوری اور بے اختیاری کا پیش خیمہ ہے —

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لئے لامکاں، میرے لئے چار سو [1]

---

[1]—جب اقبال کے ذہن پر انسان کی وکالت کی ذمہ داری کا بوجھ نہ ہو تو وہ یہی بات بڑے لطف شاعرانہ انداز میں کہہ سکتے ہیں —

سما سکتا نہیں پنہائے فطرت میں مرا سودا
غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا

انسان کی فطرت میں بلندی ہے اور بلند سے بلند تر تک پہنچنے کی نہ مٹنے والی خواہش اس کی فطرت ازلی اور یہی فطرت اس کے دل میں نئے حوصلے اور نئی آرزوئیں پیدا کرتی ہے۔ اسی فطرت کا تقاضا ہے کہ ایک چیز کی تسخیر کے بعد دوسری کی تسخیر کی طرف قدم بڑھائے۔ مہ و انجم پر اپنی کمندیں ڈالے، جبریل کو اپنا صید زبوں بنائے اور یزداں کی طرف کمند پھینکے[1]۔ لیکن بعض چیزیں ہیں کہ اس کی فطرت آزاد کے پیروں میں زنجیریں ڈالتی ہیں اور یہ فطرت آزاد تڑپ کر اور بے قرار ہوکر اپنے خالق سے فریاد کرتی ہے، کبھی عجز و انکسار کے ساتھ اور کبھی نڈر اور بیباک ہوکر—

اور کبھی نڈر اور بیباک ہوکر—

طبع بلند دادۂ بند ز پائے من کشائے
تا بہ پلاس تو دہم خلعت شہریار را

بہ بحر نغمہ کردی آشنا طبع ردانم را
زچاک سینہ ام دریا طلب، گوہر چہ می خواہی
نماز بے حضور از من نمی آید، نمی آید
دلے آوردہ ام، دیگر ازیں کافر چہ می خواہی

جس طبع رواں کی دریا مزاجی اور جس دل کی جلوہ طلبی پر انسان کو ناز ہے اس کی نظر میں ایسا جہان جہاں صرف یزداں ہے، شیطان نہیں ہے کور ذوق ہے[2]۔ ایسی طبیعت اور ایسا دل رکھنے والے انسان کی فطرت میں ایسی بلندی اور اس کی ہمت کی اتنی مردانگی ہے کہ جب خدا اس سے کہتا ہے کہ جو حالت ہے اس پر شاکر رہو تو انسان اسے جواب دیتا ہے کہ نہیں میری طبع

۱— در دشت جنوں من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

۲— مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

بلند اس صورت حال سے مطمئن نہیں[1] اقبال اس بلند فطرت، تازہ جو اور انقلاب پسند انسان کی وکالت اول تو یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ انسان کی فطرت کی تسکین کے لئے خدا کو اپنے نظام کائنات میں بعض بنیادی تبدیلیاں کرنی چاہئیں اور دوسرے اس طرح کہ وہ اس مشکل پسند فطرت کے لئے آزمائشوں کے زیادہ سامان پیدا کرے۔ زبور عجم کی ایک نظم کے چند بند پہلی قسم کے مطالبات کی بڑی واضح شاعرانہ تصویریں ہیں — ایسی تصویریں جن میں فلسفیانہ فکر اور شاعرانہ فن نے مل کر اقبال کے مسلک کی وضاحت کی ہے —

یا دگر آدم کہ از ابلیس باشد کمترک
یا دگر ابلیس بہر امتحان عقل و دیں
یا چناں کن یا چنیں

یا جہانے تازہ یا امتحانے تازہ
می کنی تا چند با ما آنچہ کردی پیش ازیں
یا چناں کن یا چنیں

فقر بخشی؟ یا شکوہ خسرو پرویز بخش
یا عطا فرما خرد یا فطرت روح الامیں
یا چناں کن یا چنیں

یا بکش دو سینۂ من آرزوئے انقلاب
یا دگرگوں کن نہاد ایں زمان و ایں زمیں
یا چناں کن یا چنیں

دوسرا مطالبہ غزل کے بعض شعروں میں ہوا ہے اور عموماً غزل کی زبان میں ہوا ہے—

فرصت کشمکش مدہ ایں دل بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر

۱— گفت یزداں کہ چنیں است و دگر ہیچ مگو
گفت آدم کہ چنیں است و چناں می بایست

انسان کو خالق مطلق نے جو بے پایاں صلاحیتیں ودیعت کی ہیں انہیں کی بدولت اسے فرشتوں تک پر تفوق حاصل ہوا ہے۔ اس علم نے انسان کو ایک ایسے احساس برتری (Superiority complex) میں مبتلا کیا ہے کہ کبھی کبھی وہ خالی ظرف کی صدا بنکر نکلتا ہے اور کبھی کبھی طعن، تشنیع اور تکبر کی صدا کی صورت اختیار کر لیتا ہے —

مقام بندگی دیگر، مقام عاشقی دیگر
زنوری سجدہ می خواہی ز خاکی بیش از آں خواہی

مقام شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد
قصور وار، غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

شوخیاں ، شکوے

اور کبھی کبھی دل کا یہ بخار شکوؤں کا دفتر بن جاتا ہے اور ساری شکایتیں، سارے طعنے، ساری بیباک گستاخیاں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بن جاتی ہیں۔ اقبال کی مشہور غزل ''اگر کج رو ہیں انجم . . . .،، طنز اور طعنے کے تیروں کا ترکش ہے—

اگر کج رو ہیں انجم، آسمان تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یا رب لامکاں تیرا ہے یا میرا؟
اسے صبح ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر
مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟
اسی کوکب کی تابانی سے ہے سارا جہاں روشن
زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

آخری شعر میں وکالت کا فن پوری چابکدستی سے بروئے کار آیا ہے۔

اقبال کے کلام میں آدم کی زندگی، اسکی تخلیقی سرگرمیوں اور ان

سرگرمیوں کی بدولت ظاہر ہونے والے غیر فانی کارناموں کی جو داستان بیان کی گئی ہے اور اس داستان کے بیان کرنے میں اقبال نے بارگاہ ایزدی میں اس کی جو نمائندگی اور وکالت کی ہے اس کی بنیاد بعض ایسی حقیقتوں پر ہے جن کا سرچشمہ قرآن حکیم کے ارشادات ہیں۔ ان حقائق پر اقبال کے تخیل نے بعض ایسی باتوں کا اضافہ کیا ہے جنہیں قیاس بڑی آسانی سے قبول کرتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کے امتزاج سے ''حیات آدم،، کی رنگین داستان مرتب ہوئی ہے۔ اس کی رنگینی میں اور بہت سی چیزوں کے علاوہ انسانی فطرت کی بعض کمزوریوں کا بھی حصہ ہے اور ابلیس کی اس شیطنت کا بھی جس نے قدم قدم پر ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا۔ اقبال کو اس کا احساس ہے اور اسلئے آدم کی وکالت کرتے وقت انہوں نے شاعرانہ تخیل کو حکیمانہ احساس کا پابند رکھا ہے اور اس حقیقت کی طرف سے چشم پوشی نہیں کی کہ آدم نے خدا کے اوصاف کا مظہر اور اس کی نیابت اور خلافت کا امین ہونے کے باوجود کبھی کبھی راہ صواب کو ترک کرکے اپنے آپ کو زندگی کے پرفسون فریب کا شکار بنایا ہے۔ پیام مشرق میں اقبال نے انسانی زندگی کے مختلف مراحل کو پانچ منزلوں میں تقسیم کرکے ہر مرحلے کے واضح پہلوؤں کو بڑے شاعرانہ انداز میں نمایاں کیا ہے۔ اس نظم کے ابتدائی چار حصوں کے عنوان ہیں (۱) میلاد آدم (۲) انکار ابلیس (۳) اغوائے آدم (۴) آدم از بہشت بیرون آمدہ می گوید۔ پانچویں حصے میں صبح قیامت کا منظر پیش کیا گیا ہے اور آدم حضور باری میں اپنی زندگی کا پورا خلاصہ بیان کرکے اپنی اس کوتاہی کی ایک حسین تاویل پیش کر رہا ہے کہ وہ جہان فسوں کار کے طلسم میں کیوں مبتلا ہوا۔ یہ حسین تاویل اقبال کی شاعرانہ وکالت کا آخری حربہ ہے اور یقیناً کامیاب حربہ ہے کہ اس میں فلسفہ، منطق اور شاعری باہم ایک دوسرے کے ہم عناں بھی ہیں اور ہمنوا بھی۔ داستان کے اس مرحلے پر اقبال کی وکالت نے جو انداز اختیار کیا ہے اس کا مفصل حال خود انہی کی زبان سے سنئے —

اے کہ ز خورشید تو کوکب جاں مستیز
از دلم افروختی شمع جہان ضریر
ریخت ہنر ہائے من بحر بہ یک نائے آب
تیشۂ من آورد از جگر خارہ شیر
زہرہ گرفتار من، ماہ پرستار من
عقل کلاں کار من بہر جہاں دارد گیر

من به زمین در شدم، من بفلک بر شدم
بستهٔ جادوئے من ذره و مهر منیر
گرچه فسونش مرا برد ز راه صواب
از غلطم در گذر، عذر گناهم پذیر
رام نه گردد جهان تا نه فسونش خوریم
جز بکمند نیاز ناز نگردد اسیر
تا شود از آه گرم این بت سنگین گداز
بستن زنار او بود مرا ناگزیر
عقل بدام آورد فطرت چالاک را
اهرمنِ شعله زاد سجده کند خاک را

پہلے چار شعروں میں انسان کی عملی سرگرمیوں کا خلاصہ ہے اور یہاں انسان اپنے تسخیری کارناموں کا ذکر اسی فخر بلکہ غرور کے ساتھ کرتا ہے جو اس نے ہر موقعے پر خدا سے مخاطب ہوتے وقت اختیار کیا ہے۔ لیکن اگلے شعر میں اس کا انداز اور لہجہ خادمانہ، نیازمندانہ اور منکسرانہ ہے۔ ''از غلطم در گذر، عذر گناهم پذیر،، میں عبودیت کی پوری شان موجود ہے اور اسکے بعد کے تین شعر اقبال کے شاعرانہ تصور اور تاویل کی حسین تخلیق ہیں۔ یہاں پہنچ کر وکالت کا وہ فریضہ تکمیل کو پہنچتا ہے جو اقبال نے ''آدم،، کی طرف سے اپنے ذمے لیا تھا۔ اس وکالت میں اقبال کی شاعری کا پورا لہجہ اس اہم وکالت کے منصب اور مقصد کے مطابق اور اس سے ہم آہنگ رہا ہے۔ حسب ضرورت اس میں تیزی اور تندی بھی پیدا ہوئی ہے اور نرمی بھی، لیکن عموماً اس پوری وکالت پر برتری کا احساس، تبختر اور تکبر چھایا رہا ہے اور اسلئے اس میں جابجا شکوہ و شکایت، طنز اور اس سے بھی بڑھ کر طعن و تشنیع کی کیفیت ہے۔ گو اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس شکوہ شکایت، طنز اور ''طعنے تشنے،، میں ہر جگہ شاعرانہ حسن اور دلکشی موجود ہے۔

مسلمان کی زندگی

اقبال کی حکیمانہ اور شاعرانہ وکالت کا دوسرا میدان مسلمان کی زندگی ہے۔ اقبال کے سامنے مسلمان کی اس زندگی کا ایک مثالی تصور ہے۔ اس مثالی تصور کا سرچشمہ ایک طرف تو قرآن حکیم کی تعلیم ہے اور دوسری طرف رسول اکرم (صلعم) کی پاکیزہ اور برگزیدہ ذات جس میں انسانی فکر، عمل

اور اخلاق کے اوصاف اپنی اعلیٰ ترین اور پسندیدہ ترین صورت میں مجتمع ہیں۔ ایک طرف تو یہ مثالی تصور اور دوسری طرف یہ واضح حقیقت کہ مسلمان بہ حیثیت فرد کے اور بہ حیثیت گروہ کے نہ صرف یہ کہ اس مثالی تصور سے بہت دور ہے بلکہ اس کی زندگی ذلت، نکبت اور تحقیر کی زندگی ہے اور وہ کہ جسے اپنے عمل اور اخلاق کی بدولت تمام بنی نوع انسان میں سب سے زیادہ معزز، محترم اور مقتدر ہونا چاہئے تھا آج عزت، احترام اور اقتدار سے محروم ہے۔ اقبال نے مسلمان کی تمدنی اور سیاسی بد حالی کا جو نقشہ بیسویں صدی کے شروع میں دیکھا اس سے ان کا دل سخت بے چین اور مضطرب تھا۔ اس بے چینی اور اضطراب میں ایک مجبوری اور بے بسی کی کیفیت بھی تھی۔ اور ان ملی جلی کیفیتوں نے اقبال میں غصہ بھی پیدا کیا تھا اور جھنجلاہٹ بھی۔ اس غصے اور جھنجلاہٹ کا نتیجہ تھا کہ اقبال نے اعتدال اور توازن کے سارے ضابطے چھوڑ کر خدا کی بارگاہ میں شکووں کا دفتر کھولا اور دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے جو کچھ منہ میں آیا کہتے چلے گئے۔ مسلمان نے ماضی کی زندگی میں جذبۂ دین داری سے سرشار ہوکر اللہ کے نام پر جو کچھ کیا تھا جی کھول کر اس کا احسان جتایا اور اس طرح جتایا کہ فرشتے بھی اس کی شوخی، و گستاخی ۱ اور بدسلیقی ۲ اور برہمی ۳ پر انگشت بدنداں رہ گئے۔ اقبال نے 'شکوہ' میں ایک وقتی جوش اور جذبے کے تحت اپنی بیباک وکالت سے جس طرح خدا کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی اس کی شدت خود اقبال نے بھی محسوس کی اور اسی احساس نے ان سے 'جواب شکوہ' لکھوایا۔ اسی لئے جب ہم اقبال کے کلام کے اس حصے پر نظر ڈالتے ہیں جس میں اقبال خدا سے مسلمان کے نمائندے یا وکیل کی حیثیت سے مخاطب ہیں تو اس میں ہمیں کسی جگہ شکوہ، طنز اور طعنہ کا وہ رنگ نہیں ملتا جو ان کے کلام کے اس حصے میں جو ''آدم،، یا انسان کے خیالات اور احساسات کی وکالت کرتا ہے۔ یہاں اقبال کے تخاطب کا انداز عموماً دعا کا ہے۔ اقبال نے اس دعا کو کہیں جذباتی نہیں بننے دیا بلکہ اسے اپنے اس نظام فکر کا تابع رکھا ہے جس میں مسلمان

---

۱ — غافل آداب سے سکان زمیں کیسے ہیں
شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں (جواب شکوہ)

۲ — ناز ہے طاقت گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو (جواب شکوہ)

۳ — اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے
تھا جو مسجود ملائک یہ وہی آدم ہے (جواب شکوہ)

کی زندگی بعض اخلاق، اور عمل ضابطوں کی پابند ہے ۔ کلام پاک میں مسلمان کو ایک خاص طرح سوچنے اور عمل کرنے یا ایک خاص طرح کے اخلاق کی پابندی کرنے اور اس اخلاق کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تعلیم دی گئی ہے ۔ اس خاص طرح زندگی بسر کرنے اور اس زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے مسلمان میں بعض اوصاف کا پیدا ہونا یا اس کی بعض صلاحیتوں کا ابھرنا ضروری ہے ۔ اقبال کو موجودہ دور کے مسلمانوں میں ان اوصاف کی نمایاں کمی محسوس ہو رہی ہے، اس لئے وہ حضور باری میں جاتے ہیں تو ان کی آرزوئیں استدعا بن کر زبان پر آتی ہیں ۔ مسلمان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد، نصب العین یا آدرش یہ ہے کہ وہ ہر طرف خیر کی روشنی پھیلائے اور شر کی جو قوتیں خیر کو پھیلنے اور آگے بڑھنے سے روکتی ہیں ان کا مقابلہ کرے، ان سے نبرد آزما ہو، ان کے سامنے سینہ سپر ہوکر کھڑا ہوجائے اور اگر ضرورت پڑے تو اپنی جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کرے ۔ مسلمان کی موجودہ زندگی قربانی اور ایثار کے اسی جذبے سے خالی ہے ۔ اسی لئے اقبال بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوتے ہیں تو اپنے معبود سے دعا کرتے ہیں کہ وہ حسین ع کی رسم ایثار کو پھر دنیا میں عام کرے —

ریگ عراق منتظر کشت حجاز تشنہ کام
خون حسین ع بازدہ کوفہ و شام خویش را

لیکن اقبال کو اس بات کا بھی شدید احساس ہے کہ وہ مسلمان جسے خیر کی تبلیغ کے لئے ہر وقت جان ہتھیلی پر رکھنے کا حکم ملا ہے آجکل جاں سپاری کے اس جذبے سے عاری اور محروم ہے، اور اس کی اس کوتاہی کا علاج بھی خالق حقیقی کے سوا کسی اور کے پاس نہیں اس لئے دست دعا اسی کے آگے پھیلاتے ہیں —

یا مسلمان را مدہ فرماں کہ جاں برکف بنہ
یا دریں فرسودہ پیکر تازہ جانے آفرین
یا چناں کن یا چنیں

ایک دوسرے انداز میں یہی گزارش یوں پیش کی جاتی ہے —

جسے نان جویں بخشی ہے تو نے اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا ایک تاریک پہلو یہ ہے کہ ان کے دلوں میں

مہرو وفا کی وہ گرمی باقی نہیں رہی جس کی بدولت ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے غم کو اپنا غم سمجھ کر اس کی آگ میں کود پڑتا تھا اور یوں شرکت غم دکھ درد کے بوجھ کو ہلکا کر دیتی تھی۔ اقبال مہرو وفا کی اس دولت کو ذات خداوندی کا عکس اور پرتو سمجھتے ہیں اور اسی لئے خدا کے سامنے دامن پھیلاتے ہیں تو ان کے دل کی بات یوں زبان پر آتی ہے —

دلوں کو مرکز مہر و وفا کر　　حریم کبریا سے آشنا کر

یہی بات کبھی کبھی اشاروں، کنایوں میں یا شاعرانہ علامتوں کے ذریعہ ادا کی جاتی ہے —

رگ تاک منتظر ہے تری بارش کرم کی
کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مئے مستانہ

اور پھر مسلمان کے لئے یہ یک وقت وہ تمام چیزیں طلب کی جاتی ہیں جن کے بغیر اس نصب العین کی تکمیل ممکن نہیں جو مسلمان کا مقسوم ہے اور جس کے بغیر اس کی زندگی ادھوری رہتی ہے —

شراب کہن پھر پلا ساقیا　　وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا　　مری خاک جگنو بنا کر اڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر　　جوانوں کو پیروں کو استاد کر
ہری شاخ ملت ترے نم سے ہے　　نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے　　دل مرتضیٰ، سوز صدیق دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر　　تمنا کو سینوں میں بیدار کر

''وہی تیر،، میں ماضی اور حال کے مسلمانوں کے فرق کی طرف بڑا بلیغ اشارہ ہے۔

بارگاہ خداوندی میں اقبال کی حضوری کی یہ دوسری صورت، جس میں وہ مسلمانوں کے وکیل بن کر سب کچھ کہتے ہیں، اس پہلی صورت سے مختلف ہے جہاں وہ انسان یا آدم کے نمائندے اور وکیل کی حیثیت سے خدا سے ہم کلام ہیں۔ اقبال کا مقصد اور نصب العین بعض اساسی وجوہ کی بنا پر دونوں صورتوں میں مختلف ہے اور اس مقصد اور نصب العین کے اختلاف نے

ان کے تخاطب کے انداز اور لہجے میں فرق پیدا کیا ہے ۔ پہلے موقع پر شکوہ و شکایت کی جو تیزی اور تندی اور طعن و تشنیع کی جو ناگوار تلخی ہے وہ اس عبرت انگیز صورت حال کی پیدا کی ہوئی ہے جس میں انسان اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود مبتلا ہے ۔ دوسری صورت میں بات مسلمان کی طرف سے کی گئی ہے اسلئے بات میں عاجزانہ اور منکسرانہ دعا کا رنگ ہے ۔ تخاطب کی تیسری صورت وہ ہے کہ جب اقبال اپنی ذاتی حیثیت میں، اس طرح اپنے خدا یا معبود سے ہم کلام ہیں جیسے ایک بندے کو ہونا چاہئے ۔ یہاں ان کی ہر بات میں حفظ مراتب کی نزاکت بھی ہے، عبودیت کا عجز و انکسار بھی اور ان دونوں چیزوں کے ساتھ ناز و نیاز کے رشتے کی بے لوث رنگینی بھی ۔ اسی لئے اقبال نے بہ حیثیت اقبال کے جب اپنے معبود سے ہم کلامی کی سعادت حاصل کی ہے تو کبھی اسے ایک ایسے محبوب کی صورت میں دیکھا ہے جس کا جلوہ ہر حسن میں دکھائی دیتا ہے اور کبھی اس قادر مطلق کے روپ میں کہ جس سے ہر چیز طلب بھی کی جا سکتی ہے اور طلب کرنے کے بعد یہ یقین بھی رکھا جا سکتا ہے کہ اس سے جو کچھ مانگا جائے گا وہ ملے گا ۔ اقبال نے اپنے معبود اور خالق کو اپنی ہر آرزو کے حصول کا مرکز بنایا ہے اور ان آرزوؤں کی نوعیت ان آرزوؤں سے کہ جو آدم اور مسلمان کے نمائندے یا وکیل کی حیثیت سے ان کے دل میں پیدا ہوتی ہیں بعض باتوں میں ملی جلی ہونے کے باوجود ان سے مختلف ہے ۔ یہ آرزوئیں ایک طرف تو اقبال کے ان احساسات کی پیدا کی ہوئی ہیں جو معاشرتی زندگی بسر کرنے والے ایک حساس انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور دوسری طرف ان تصورات کی جو زندگی اور اس زندگی کے ساتھ انسان کے تعلق کے سلسلے میں اقبال کے فکر نے مرتب کئے ہیں ۔ اقبال فلسفی ہیں، شاعر ہیں اور اپنی نجی زندگی میں دل گداز اور چشم نم رکھنے والے رقیق القلب انسان ۔ اقبال کی شخصیت کے یہ تینوں پہلو ان کے کلام کے اس حصے میں جہاں انہوں نے اپنی ذاتی حیثیت سے اور اپنے شخصی رشتے کی بنا پر خدا کو مخاطب کیا ہے، طرح طرح سے اپنا جلوہ دکھاتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کے کلام کا یہ حصہ لہجے کے انکسار اور نیازمندی کی بنا پر بھی اور شاعرانہ انداز نظر اور حکیمانہ طرز فکر کا عکس ہونے کی وجہ سے بھی لطیف اور گہرے تاثرات کا حامل ہے ۔

اقبال— بارگاہ خدا میں

اقبال نے اپنی ذاتی حیثیت میں خدا سے جو تعلق قائم کیا ہے اس میں

شکوہ شکایت کی جگہ قناعت و شکر نے لی ہے اور قانع اور شاکر اقبال نے بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوکر جب اپنے معبود کو مخاطب کیا ہے تو ان کے لہجے میں سپردگی کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ اقبال کے لئے حق تعالیٰ سے ہم کلامی بجائے خود ایک ایسی سعادت ہے جس کا نشہ انہیں سرشار و مخمور رکھتا ہے اور اس سرشاری و خمار کا عکس ان کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ میں گولاوٹ بھی پیدا کرتا ہے اور تاثیر بھی۔ اپنی حالت دل ایک جگہ یوں بیان کرتے ہیں —

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ

یہ کیفیت کبھی شکایت کی صورت بھی اختیار کرتی ہے تو عاجزی اور انکساری کا دامن اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا —

من ہماں مشت غبارم کہ بجائے نرسد
لالہ از تست و نم ابر بہاری از تست

یا رب یہ جہان گزران خوب ہے لیکن
کیوں خوار ہیں مردان جفاکیش و ہنرمند

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی، وہاں جینے کی پابندی

بہ حیثیت مفکر، بہ حیثیت شاعر اور بہ حیثیت انسان اقبال کے دل میں طرح طرح کی آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں۔ اقبال نے اپنے خدا کے ساتھ عبودیت کا جو رشتہ قائم کیا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان تینوں حیثیتوں سے ان کا دل جن آرزوؤں کی تخلیق کرتا اور جن آرزوؤں کی تکمیل کے لئے بے قرار ہوتا ہے انہیں وہ حضور باری میں لے جائیں، کمال نیازمندی سے دامن پھیلائیں اور گڑ گڑا کر دعا مانگیں کہ اے میرے مولیٰ! میرے خالی دامن کو گلہائے مراد سے بھردے۔ اقبال کا احساس خودی اور ان کی آرزوئے فقر جس جس طرح

دعا بن کر زبان پر آتی ہے اس کا جلوہ چند شعروں میں دیکھئے ۔ —

یا رب دروں سینہ دل با خبر بدہ
در بادہ نشہ را نگرم آن نظر بدہ
این بندہ را کہ با نفس دیگراں نزیست
یک آہ خانہ زاد مثال سحر بدہ

خواجہ من ! نگاہ دار آبروئے گدائے خویش
آنکہ ز جوئے دیگراں پر نکند پیالہ را

دل زندہ کہ دادی بہ حجاب در نسازد
نگہے بدہ کہ بیند شرر ے بہ سنگ خارہ

بجلال تو کہ در دل اگر آرزو ندارم
بجز این دعا کہ بخشی بکبوتران عقابی

کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو
یا رب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

خالق حقیقی کی ادنیٰ سی توجہ بھی قطرے کو گہر اور ذرے کو آفتاب بنا سکتی ہے —

از چمن تو رستہ ام قطرۂ شبنمے بہ بخش
خاطر غنچہ وا شود، کم نشود ز جرئے تو

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
تیرے پیمانے میں ہے ماہ تمام اے ساقی !
میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ مرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہر آبدار کر

تکمیل کی کسی منزل تک پہنچنے کی آرزو کبھی ذات خداوندی میں جذب و حل ہونے کی آرزو بن جاتی ہے —

تو ہے محیط بیکراں میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر، یا مجھے بے کنار کر

وہی اقبال جو کبھی کبھی 'داد' یا 'صلے' کی تمنا سے آزاد اور بے نیاز ہو کر صرف فریاد سنانے کی لذت میں گم رہنا چاہتے ہیں [1] کبھی کبھی خاموشی اور بے زبانی کو اپنی زبان اور اپنا تکلم بناتے ہیں اور ایسے موقعوں پر عموماً ان کی بات تغزل کی دلکش کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے —

گلہ ہا داشتم از دل بزبانم نرسید
مہر و بے مہری و عیاری و یاری از تست
ز حکایت دل من تو بگو کہ خوب دانی
دل من کجا کہ اورا بکنار من نیابی

گو مرا ذوق بیاں دادئی و گفتی کہ بگوئے
ہست در سینہ من آنچہ بکس نتواں گفت

"آنچہ بکس نتواں گفت" میں راز و نیاز کے جس رشتے اور تعلق کا رمز پوشیدہ ہے اس کی جھلک شاعر اقبال کے بہت سے شعروں میں طرح طرح سے دکھائی دیتی ہے۔ یہ شعر جہاں ایک طرف اس حقیقت کے مفسر ہیں کہ بندے کو اپنے معبود کی ناز برداری پر بڑا ناز ہے، دوسری طرف اس شاعرانہ حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ یگانگت اور محبت کی سچائی، وارفتگی اور فدائیت جب شعر کے سانچے میں ڈھلتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دل کے سارے گداز نے پگھل کر شعر کے پیکر میں جنم لیا ہے۔ اقبال کے فارسی اور اردو کلام میں تغزل کے رنگ میں ڈوبے ہوئے بہت سے شعر ایسے ہیں جن میں بندہ خدا سے اس طرح مخاطب ہے جیسے محبوب سے۔ مخاطب ہونے والا خود کو عاشق شیدا سمجھ کر اپنے محبوب کی ہر ادا کا تذکرہ مزے لے لے کر اور جھوم جھوم کر کر رہا ہے —

نہ تو در حرم گنجی نہ در بتخانہ می آئی
و لیکن سوئے مشتاقاں چہ مشتاقانہ می آئی

قدم بیباک تر نہ در حریم جان مشتاقاں
تو صاحب خانہ آخر چرا دزدانہ می آئی

---

۱ — اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

بفاوت می بری سرمایهٔ تسبیح خواناں را
بہ شبخون دل زناریاں ترکانہ می آئی
گہے صد لشکر انگیزی کہ خون دوستاں ریزی
گہے در انجمن با شیشہ و پیمانہ می آئی

اے کہ نزدیک تر از جانی و پنہاں زنگہ
ہجر تو خوش ترم آید ز وصال دگراں

در مرج صبا پنہاں دزدیدہ بباغ آئی
در بوئے گل آمیزی، با غنچہ در آویزی
من بندۂ بے قیدم شاید کہ گریزم باز
ایں طرۂ پیچاں را در گردنم آویزی

حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوئے محبت کو
مری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی

خدا کی ذات کو ہر طرح کی شان محبوبی کا مرکز اور ہر محبوب سے برتر و اعلیٰ سمجھنے والے اقبال کا ذہن جب شاعری کے حریری پردے اٹھا کر دیکھتا ہے تو بیساختہ اس کی زبان سے نکل جاتا ہے—

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں
باقی ہے نمود سیمبائی

اور پھر اقبال اسی بات کو بار بار دہراتے ہیں اور پورے عقیدے اور ایمان کے ساتھ دہراتے ہیں—

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ رنگ کو دیا تونے طلوع آفتاب
شوکت و سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب
تیری نگہ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب

یہی احساس لطیف تر شاعرانہ انداز میں ایک اور جگہ اسطرح ظاہر ہوا ہے

میرا نشیمن نہیں درگہ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو، شاخ نشیمن بھی تو
تجھ سے گریباں مرا مطلع صبح نشور
تجھ سے مرے سینے میں آتش اللہ ہو!
تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ
تو ہی مری آرزو، تو ہی مری جستجو
پاس اگر تو نہیں شہر ہے ویران تمام
تو ہے تو آباد ہیں اجڑے ہوئے کاخ و کو

خدمت انسانیت

اقبال ہر طرح کے فن کو، جس میں شاعری بھی شامل ہے، انسان کی خدمت اور رہنمائی کا وسیلہ سمجھتے ہیں، اس لئے اس خدا سے جو ان کی تمام تر آرزوؤں کا مرکز و منبع ہے اپنے شعر کے لئے حسن تاثیر کی دعا بھی بڑے عاجزانہ اور موثر شاعرانہ انداز میں کرتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں —

بضمیرم آنچناں کن کہ ز شعلۂ نوائے
دل خاکیاں فروزم، دل نوریاں گدازم

دل خاکیاں فروزم اور دل نوریاں گدازم والی آرزو کبھی کبھی اپنے سارے گرد و پیش کو اپنی گرفت میں لینا چاہتی ہے اور اقبال کے دل کی تڑپ ایک طویل دعا بنتی اور نرم و نازک لے میں فضا میں گونجنے لگتی ہے —

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر! — زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر!
جوانوں کو سوز جگر بخش دے — مرا عشق میری نظر بخش دے
مری ناؤ گرداب سے پار کر — یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر
بتا مجھکو اسرار مرگ و حیات — کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز

امنگیں مری، آرزوئیں مری
امیدیں مری، جستجوئیں مری

مری فطرت آئینۂ روزگار
غزالانِ افکار کا مرغزار

مرا دل مری رزم گاہ حیات
گمانوں کے لشکر، یقیں کا ثبات

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹادے اسے!
لٹادے! ٹھکانے لگا دے اسے!

یہاں دعا کی لے نے اپنی ذات سے بڑھکر پوری نوعِ انسانی کا احاطہ کیا ہے، اور جس انسان کی فلاح کو اقبال نے اپنی حکمت اور اپنے شعر کا مقصد بنایا ہے اپنا سب کچھ اس پر قربان کردینا چاہتے ہیں اور ایثار اور قربانی کے اس فریضے کی ادائیگی میں بڑے والہانہ انداز میں اپنے خدا سے کہتے ہیں کہ میری ساری متاع کو میری نوع میں تقسیم کردے کہ اس متاع کا بہترین مصرف یہی ہے۔ یہی اقبال کی آرزو تھی اور اس لئے ان کی دعاؤں کی معراج ہے۔

اقبال نے شاعری شروع کی تو وہ وطن کی محبت کے جذبے سے سرشار تھے اور شاعری کے اس دور میں یہ احساس ان کے دل میں کانٹے کیطرح کھٹک رہا تھا کہ ان کے اہل وطن امتیاز آئین و ملت کے پھندے میں گرفتار ہیں۔ یورپ کے قیام کے زمانے میں مطالع اور مشاہدے نے ان کے تصورات میں تبدیلی پیدا کی اور وہ ایک طرف بنی نوع انسان کی عظمت اور دوسری طرف اسلامی اخوت کے پیامی بن کر دنیا کے سامنے آئے اقبال کے فکر نے ان پیغاموں کو ایک منظم فلسفۂ حیات کی شکل دی۔ ان کے شاعرانہ تخیل نے اس فلسفے کو ایک دل نشین پیکر عطا کیا اور ان کے جذبے کے خلوص اور شدت نے اس فلسفے کو دل کی گہرائیوں تک پہنچایا۔ یوں گویا اقبال کی پوری شاعری ان کی شخصیت کے تین رخوں (فکری، تخیلی، اور جذباتی) کا مکمل آئینہ اور ان کے رچے ہوئے امتزاج کی ایک موثر صورت ہے۔ ان کی شخصیت کے یہ تینوں رخ ان کی شاعری کے ہر پہلو میں نمایاں دکھائی دیتے ہیں، لیکن اس کا جتنا واضح اظہار ان تینوں حیثیتوں سے، جسطرح ان کے کلام کے اس حصے میں ہوا ہے جہاں وہ بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوکر خداوند تعالیٰ سے مخاطب ہوئے ہیں کسی اور موقع پر نہیں ہوا۔ خدا سے مخاطب ہوتے وقت اقبال نے تین مختلف منصب ادا کئے ہیں۔ اور یہ منصب ادا کرتے وقت نہ فکری تقاضوں کو نظر انداز کیا ہے نہ شعری مطالبات کو۔ ان کے نغمے

کی لے ان کے منصب کے مقاصد کے ساتھ بدلی اور اس سے ہم آہنگ رہی ہے، اور یہ بات صرف اسی صورت میں ممکن ہوسکتی ہے کہ شاعر کے فکری نظام میں کسی طرح کا انتشار نہ ہو، وہ مفکر ہونے کے باوجود یہ نہ بھولے کہ وہ شاعر ہے اور ان دونوں چیزوں کے ساتھ ساتھ یہ یاد رکھے کہ فکر اور شعر کو جب تک جذبے میں نہ سمویا جائے ان میں نہ صداقت پیدا ہوتی ہے نہ تاثیر۔